داستانِ حسرت

منتظر شام سے در کھول کہ صیادِ صبا
اک گلی کے کسی نکڑ پہ کھڑا کہتا تھا
چاہنے والو! نگاہوں کو جھکا لو کہ یہاں
ایک معصوم سا بھولا سا صنم رہتا تھا

وہ صنم جس کی نگاہوں پہ حیا کا پہرا
جس کے آنچل پہ تھا عفت کا نشاں بھی گہرا
یوں تھیں پلکیں کہ عقب تند ہوا ہو جیسے
تھا تکلم کے ہو فرصت سے لکھا اک سہرا

جو نگاہوں کے تقدس کا سزاوار رہا
عشق سے دور رہا عشق کا بیمار رہا

از خطا گر کبھی نظروں کا تصادم ہوتا
رُخِ روشن پہ تمازت کا طلبگار رہا

اک طلب عشق کی، ریکھا میں نہیں تھی تقدیر
خوئے تسلیم سے عاری یوں جنوں کی تصویر
بھولنا چاہوں بھی تو بھول نہیں پاؤں گا
تر تھی اشکوں سے مگر شوخ تھی اس کی تحریر

لفظ تھے خون کشیدہ سا ہو چہرہ جیسے
خط کی ہر سطر پہ مفہوم کا پہرہ جیسے
مجھ سے ملنے کی تمنا تھی پری وش نے لکھی

تھی نشاں بوس، کوئی زخم ہو گہرا جیسے

صد تمنا ہے کہ بس حاصل و موجود دِکھے
لکھنے والے نے مقدر میں وہ لمحات لکھے
رات کب گزرے گی کب سحر سپیدا ہوگی
کیا تصور ہو کہ بس آج کی یہ رات کٹے

مضمحل جسم تھا دل تھام کے رستے پہ کھڑا
طول رستے کا شبِ ہجر سے دو ہاتھ بڑا
آنکھ اٹھتی نہ اُدھر، پلک جھپکتی نہ اِدھر
وقتِ رفتہ پہ ہے کب سوز سے کچھ فرق پڑا

لفظ خاموش تھے لمحات میں وہ حدت تھی
روح بے چین کہ جذبات میں وہ شدت تھی
تھی شکایت نہ وہاں کوئی حکایت، نہ سوال
بنا اظہار کے اقرار میں بھی جدت تھی

دستکِ در تھی کہ آوازِ سرافیلِ قضا
حادثہ موت بنا، چھین گیا یار وفا
تھا تبسم، نہ تکلف، نہ ہی تکلیف کوئی
ایک مٹھی میں، محبت مجھے تم سے ہے، لکھا

منتظر شام سے در کھول کہ صیادِ صبا
ہر گھڑی درد کی دولت کو ہے نیلام کرے
سونپ کے عقل سرابوں کے دھنی داروں کو
عشق کا کھیل زمانے میں سرِعام کرے